مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

طلاق و تفریق : ایک تقابلی جائزہ

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، اللہ کی طرف سے جو تعلیم دینے کے لیے مامور کیے جاتے ہیں، اس تعلیم کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک اخلاقی تعلیم، دوسرے قانونی تعلیم (شریعت)

قانون میں اخلاقی اصولوں کی آمیزش کا ٹھیک تناسب بھی پیغمبر قائم کرتے ہیں، تاکہ اخلاقی اصولوں اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے مابین توازن قائم رہ سکے۔

کچھ پیغمبروں کا مشن اخلاقی تعلیم کے ساتھ قانونِ شریعت کا نفاذ بھی رہا ہے، اور کچھ پیغمبروں کا مشن صرف اخلاقی تعلیم تک محدود رہا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اخلاقی تعلیم کے ساتھ شریعتِ الٰہیہ کا نفاذ بھی فرمایا، مگر حضرت عیسیٰ مسیحؑ صاحبِ شریعت نہ تھے، اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا، اس لیے ان کے ارشادات میں ہمیں اخلاق کے ابتدائی اصول ہی مل پاتے ہیں۔

نبوت کے سلسلہ زرّیں کی آخری کڑی خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہؐ نہ صرف معلّم اخلاق اور صاحبِ شریعت تھے، بلکہ قانونِ شریعت الٰہیہ کی تکمیل بھی آپ ہی پر ہوئی --- (اَلیومَ اَکملتُ لَکُم دِینَکُم وَ اَتممتُ عَلَیکُم نعمَتِی وَ رَضِیتُ لَکُم الاِسلَامَ دِیناً)

حضرت عیسیٰؑ حضرت محمد رسول اللہؐ کی اخلاقی تعلیم میں فرمایا گیا ہے :

جسے خدا نے جوڑا، اسے آدمی جدا نہ کرے (متی ۱۹ : ۴)۔

قرآن مجید میں ہے :

اَلَّذِینَ یَنقُضُونَ عَھدَاللہِ مِن بَعدِ مِیثَا قِہ وَیَقطَعُونَ مَااَمَرَاللّٰہُ بہ اَن یُّوصَلَ وَ یُفسِدُونَ فِیَ الاَرضِ اُولٰئِکَ ھُمُ الخٰسِرُونَ (البقرہ : ۲۷)

جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے

ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے، وہ زنا کرتا ہے۔ (متی ۱۹: ۹)

حضرت محمدؐ نے ارشاد فرمایا:

اَبغَضُ الحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ (ابوداؤد، مشکوۃ باب الخلع والطلاق، الفصل الاول) اللہ کے نزدیک جائز کاموں میں سب سے زیادہ بُرا کام طلاق ہے۔

ہر دو پیغمبروں کے ان ارشادات کا تعلق اخلاقی ہدایات سے ہے، نہ کہ قانونِ شریعت سے۔ ان ہدایات میں اشخاص کو تعلیم دی گئی ہے کہ شریعت کے قانون پر عمل پیرا ہونے میں وہ مذکورہ ہدایات کو پیش نظر رکھیں۔

سینٹ پال نے حضرت مسیحؑ کی ان اخلاقی ہدایتوں کو لے کر اپنے آپ کو شریعتِ الٰہی سے بے نیاز سمجھ لیا، اور ان اخلاقی اصولوں پر خود قانون سازی کا کام شروع کر دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ارشاد کہ ''جسے خدا نے جوڑا، اسے آدمی جُدا نہ کرے۔'' کو لے کر یہ قانون بنایا کہ ایک مرتبہ نکاح ہونے کے بعد کبھی جدائی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تعلق خدا نے جوڑا ہے اور آدمی اس کو توڑنے کا حق نہیں رکھتا۔

اب رہی یہ آیت کہ ''جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑے اور دوسرا بیاہ کرے، وہ زنا کرتا ہے،'' کیونکہ یہ آیت پہلی آیت سے ٹکراتی ہے کہ اس میں حرام کاری کی وجہ سے چھوڑنے کی اجازت ملتی ہے، اس لیے اس آیت کی دو طرح سے توجیہ کی گئی ہے۔

ایک تو یہ کہ حرام کاری کی وجہ سے طلاق دینے کا استثناء بعد کا اضافہ ہے اور اصل حکم وہی ہے کہ موت کے سوا جدائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حرام کاری کی صورت میں میاں بیوی میں جدائی تو کرائی جائے گی، مگر نکاح بدستور قائم رہے گا، اور دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

صدیوں تک مسیحی دنیا اس پر عمل کرتی رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عقل کے تراشے

ہوئے اس غیر فطری قانون کی بدولت مسیحی دنیا میں بداخلاقی پھیلتی چلی گئی۔

اس شدید اور ناقابلِ عمل قانون سے بچنے کے لیے مسیحی علماء نے طرح طرح کے شرعی حیلے نکال رکھے تھے۔ ایک حیلہ یہ تھا کہ کسی طور پر یہ ثابت کیا جائے کہ مرد و عورت نے ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ ان سے بلا ارادہ سرزد ہو گیا تھا، تو اس صورت میں مذہبی عدالت ''بطلانِ نکاح'' کا فیصلہ کر دے گی، اور نکاح باطل ہونے کا یہ مطلب تھا کہ سرے سے کوئی نکاح ہوا ہی نہیں۔ اب تک ان میں ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی، وہ حرامی اولاد تھی۔

کلیسائے روم کے ''مذہبی قانون'' میں تفریق کے لیے چھ صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔

۱- زنا یا خلافِ فطرت جرائم

۲- نامردی

۳- ظالمانہ برتاؤ

۴- کفر

۵- ارتداد

۶- زوجین کے درمیان خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا

مذکورہ چھ صورتوں میں قانونی چارہ کار یہ تجویز کیا گیا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ اِس قانونی تفریق کے معنی رشتہ نکاح کے پورے طور پر ختم ہونے [طلاق] کے نہیں تھے کہ اس کے بعد بھی زوجین میں سے کوئی دوسرا نکاح کر سکے۔

رومن چرچ کے مقابلے میں ''راسخ العقیدہ مشرقی کلیسا'' نے نسبتاً ایک بہتر اور قابلِ عمل قانون بنایا۔ اس کے نزدیک زوجین کو حسبِ ذیل وجوہ کی بناء پر بندِ نکاح سے آزاد کیا جا سکتا ہے۔

۱- زنا اور اس کے مقدمات

۲- ارتداد

۳- شوہر کا اپنی زندگی کو قسیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کر دینا

۴- بغاوت

۵- نشوز
۶- نامردی
۷- جنون
۸- برص و جذام
۹- طویل مدت کے لیے قید
۱۰- باہمی نفرت اور مزاج کی ناموافقت

واضح رہے کہ ''راسخ العقیدہ مشرقی کلیسا'' کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے، اس لیے اس کے قانون میں اسلامی فقہ کی واضح جھلک نظر آتی ہے، لیکن مغربی ملکوں کے مذہبی پیشوا مشرقی کلیسا کے اس قانون کو نہیں مانتے۔

انقلابِ فرانس سے پہلے تک یورپ کے زیادہ تر ملکوں میں رومن چرچ کا مذہبی قانون چلتا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزادی تنقید اور آزادی فکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے فرانس نے اس مذہبی قانون کی کمزوریوں کو دیکھ کر بر ے سے اس مذہبی قانون کا جوا ہی اپنے کندھے سے اُتار پھینکا۔ اس کے بعد آزادی کی یہ ہوا دوسرے ملکوں تک پہنچی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سوئزرلینڈ وغیرہ ملکوں نے بھی مذہبی قانون چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانینِ نکاح و طلاق وضع کر لیے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہو جانے کے بعد مغربی ملکوں میں جواز دواجی قانون وضع کیے گئے ہیں، ان کے بنانے میں اگرچہ سیکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے اور تجربات کی روشنی میں برابر اصلاحیں بھی کی جاتی رہی ہیں، لیکن ان سب کوششوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ اعتدال اور توازن پیدا نہیں ہو سکا جو عرب کے ایک اُمّی کے پیش کیے ہوئے قوانین میں پایا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر انگلستان میں ۱۸۵۷ء سے پہلے زنا اور ظالمانہ برتاؤ کی وجہ سے زوجین میں تفریق کی جاسکتی تھی، مگر طلاق نہیں تھی کہ اس کے بعد زوجین میں سے کوئی دوسرا نکاح

کر سکے۔ پھر ۱۸۵۷ء میں زنا اور ظالمانہ برتاؤ کے علاوہ تعلقاتِ زوجیت کا انقطاع (deser-tion) کو بھی شامل کر لیا گیا، بشرطیکہ یہ انقطاع دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ یہ اسلامی قانونِ ایلاء کی ایک ناقص نقل تھی۔ ۱۸۵۷ء ہی کے قانون میں ایک تبدیلی اور کی گئی کہ تفریق کے ساتھ طلاق کو بھی جائز کیا گیا، مگر طلاق کے لیے شرط لگائی گئی کہ مرد اور عورت عدالت سے رجوع کریں۔ بطورِ خود طلاق کا فیصلہ نہیں کر سکتے اور عدالت کے لیے طلاق کی ڈگری دینے کی صرف ایک ہی صورت رکھی گئی کہ دونوں میں سے جو طلاق لینا چاہے، وہ دوسرے فریق کا مرتکبِ زنا ہونا ثابت کرے۔ اس قانون میں شوہر کو یہ حق بھی دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے اپنی بیوی کی عصمت کا ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔

۱۸۸۶ء میں قانون بنایا گیا جس میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح توڑنے کے ساتھ ساتھ ''خطاکار'' شوہر سے عورت کو نفقہ دلوا سکتی ہے۔ ۱۹۰۷ء کے قانون میں شوہر کے خطاکار ہونے کی شرط اڑا دی گئی اور عدالت کو یہ اختیار دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے، مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈال دے — ہندوستانی قانون کی دفعہ ۱۲۵ اسی کی نقل ہے۔

انگلستان کے بہترین دماغوں کی پچاس برس کی پے در پے محنت کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں ۱۸۹۵ء میں ایک قانون بنایا گیا کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی زیادتیوں کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلی جائے تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی، بچوں کو عورت کے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی، اور اگر اس صورت میں عورت زنا کی مرتکب ہے تو اس کے خلاف شوہر کا طلاق کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہوگا۔

۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے آخر میں رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں دیگر سفارشات کے علاوہ ایک سفارش یہ تھی، جسے قبول کر کے ۱۹۲۳ء کے قانون Matrimonial Cases Act میں شامل کیا گیا کہ

> طلاق کے اسباب اور وجوہ کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے۔ مثلاً اگر شوہر ایک بار بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

انگلستان کے یہ بہترین دماغ عورت یا مرد کے ارتکابِ زنا کا فطری فرق تک نہ سمجھ سکے

اور اس قانون کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے مقدمات کی بھر مار ہوگئی، یہاں تک کہ عدالتیں پریشان ہوگئیں اور ۱۹۲۹ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivalle) کو ان کی روک تھام کرنا پڑی۔

آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین پر رومن چرچ کا اثر ہے اور وہاں رشتہ نکاح اب تک ناقابل انقطاع ہے۔ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو جاتی ہے، مگر قانونی تفریق کے بعد زوجین نہ مل سکتے ہیں، نہ آزاد ہو کر نکاحِ ثانی کر سکتے ہیں۔

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

فرانس میں قانونِ ازدواج بہت سے نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا تھا۔ نپولین کے قانون میں اس پر کچھ پابندیاں لگائی گئیں۔ ۱۸۱۶ء میں طلاق قطعاً ممنوع کر دی گئی۔ ۱۸۸۴ء میں طلاق پھر جائز کی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۴ء میں طلاق کے لیے مختلف قانون بنائے گئے جن میں طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے زوجین میں سے کسی ایک کا ارتکابِ زنا، زوجین میں سے کسی ایک کا ایسا فعل جس سے اس کے ساتھی کی عزت پہ حرف آئے، حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت اور عدالت سے موجبِ ذلت سزا، وجوہِ طلاق قرار دیے گئے۔ اس قانون میں اسلام کے قانونِ عدت کی ناقص نقل کرتے ہوئے طلاق کے بعد تین سو دن کی عدت مقرر کی گئی۔

اسلام میں عدت کی اصل غرض براءتِ رحم ہے کہ مرد سے الگ ہونے کے بعد یہ اطمینان کر لیا جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں۔ اس کے لیے اسلام نے فطری صورت تین حیض اختیار کی ہے، البتہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے۔ اس فطری صورت کے مقابلے میں تین سو دن یا دس مہینے کی عدت کے لیے فطری بنیاد کیا ہے؟

آسٹریا، بلجیم، سوئزرلینڈ اور ناروے میں مرد اور عورت صرف باہمی رضامندی سے ہی طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی اسلام کے قانونِ خلع کی ایک ناقص سے نقل ہے۔

جرمنی میں زوجین اگر مسلسل ایک سال تک ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں تو طلاق ہو سکتی ہے۔ اس میں اسلام کے قانونِ ایلاء کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔

سوئزرلینڈ میں یہ مدت تین سال ہے اور ہالینڈ میں پانچ سال۔ دوسرے ملکوں کے قانون اس باب میں خاموش ہیں۔

سویڈن میں شوہر کے لاپتہ ہونے پر مدتِ انتظار چھ سال ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے ملکوں نے اس سلسلہ میں کوئی قانون وضع نہیں کیا۔

پاگل پن کی صورت میں جرمنی، سویڈن اور سوئزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے۔ باقی ملکوں میں اس کے لیے کوئی قانون نہیں ہے۔

بلجیم میں مطلقہ کی عدت دس مہینے ہے، فرانس میں تین سو دن، باقی ملکوں میں عدت کا کوئی قانون نہیں ہے۔

آسٹریا کا قانون یہ ہے کہ اگر مرد یا عورت میں سے کسی کو پانچ سال قید کی سزا ہو جائے تو طلاق کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ بلجیم میں صرف سزایاب ہونا طلاق کے دعوے کے لیے کافی ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے حبسِ دوام کی شرط ہے۔

یورپ کے ملکوں میں طلاق کے قانون ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں، مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں مل سکی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا، اس کو ماننا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرتِ انسانی کی رعایت، فتنوں کا سدباب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں اسلامی قانون حدِ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ پھر اس نمایاں فرق کے باوجود اگر انسان اپنے زندگی کے معاملات میں ہدایتِ الٰہی کی ضرورت سے انکار کرے تو اس کو حماقت کے سوا اور کیا عنوان دیا جا سکتا ہے۔؟